کنز المدارس بورڈ کے نصاب میں شامل کتاب

اجابۃُ السّائِلین کا پہلا ترجمہ بنام

مرآۃُ السّائِلین
علی
إجابۃِ السّائِلین

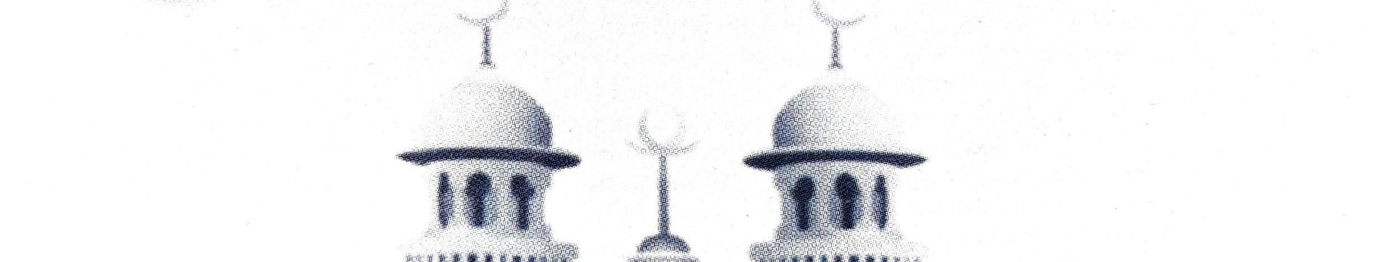

مؤلف و مرتب

ابو عدن عبد العلی مدنی

ایم فل عربیک، پنجاب یونیورسٹی لاہور

نشانِ منزل پبلی کیشنز

سوال 1: کیا یہ کہنا درست ہے کہ "اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو دنیا، جنت، دوزخ اور آسمان وزمین پیدا نہ کیے جاتے؟" اور کیا یہ بات دین کے اصولوں اور بنیادی عقائد کے خلاف تو نہیں؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں، یہ بات بالکل درست اور سچی ہے، اور یہ متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ امام دیلمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہا: "اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ نہ ہوتے تو میں جنت کو پیدا نہ کرتا، اور اگر آپ نہ ہوتے تو میں دوزخ کو پیدا نہ کرتا۔"

پس مذکورہ قول دین کے اصولوں اور قواعد سے متصادم نہیں بلکہ احادیث اور جلیل القدر علماء کے اقوال سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

سوال 2: کیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں یا بشر؟

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری اعتبار سے بشر ہیں، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا:

قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّیۡ هَلۡ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا

"تم فرماؤ پاکی ہے میرے رب کو میں کون ہوں مگر آدمی اللہ کا بھیجا ہوا۔" [سورۃ الإسراء:94] (کنزالایمان)

البتہ بعض مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "نور" بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ مفسرین نے سورہ مائدہ کی آیت:

قَدۡ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ

ترجمہ کنزالایمان: بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب۔ (سورۃ المائدہ:15 کنزالایمان)

کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "نور" سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں اور طبری، رازی، بیضاوی، جلالین، خازن، نسفی، صاوی اور دیگر معتبر کتابوں میں بھی مذکور ہے...... اور علماء نے فرمایا ہے کہ بشریت اور نورانیت کے درمیان کوئی منافات نہیں۔

سوال:3 کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں زندہ ہیں؟ اور ان کی اس زندگی کا ہماری دنیاوی زندگی پر کیا اثر ہے؟

جواب: انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد ان کی زندگی ایک برحق، صحیح اور قرآنِ کریم و احادیثِ نبویہ سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (سورۃ آل عمران:169)

ترجمہ کنز الایمان: اور راہِ خدا میں جو مارے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ سمجھ، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی دیے جاتے ہیں۔

یہ آیت انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد ان کی زندگی پر بطورِ مفہومِ موافقت دلالت کرتی ہے، کیونکہ انبیاء شہداء سے اس فضیلت کے زیادہ حق دار ہیں، اور یہ آیت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر بھی اپنے عموم کے ساتھ دلالت کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت اور شہادت دونوں کا شرف عطا فرمایا، جیسا کہ یہ بات ثابت ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "کوئی نبی ایسا نہیں جس میں نبوت کے ساتھ ساتھ شہادت کی صفت نہ ہو، پس وہ سب اس آیت کے عموم میں داخل ہیں"۔ انتھی۔

اس پر دلالت کرنے والی احادیث بھی درج ذیل ہیں:

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرنا ہوا، وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے"۔

ابو یعلیٰ اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں، نماز پڑھتے ہیں"۔

ابوداؤد اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو کھانے سے منع فرمادیا ہے"۔

پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں بھی روح اور جسم کے ساتھ ایک حقیقی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں، اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں، جو ان پر سلام بھیجتا ہے اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں، اپنی امت کے لیے شفاعت کرتے ہیں، ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں، جیسا کہ خود صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے۔
علماء اور سلف کے اقوال انبیاء کی زندگی کے اثبات میں اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔

سوال 4: کیا واقعی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کے بعد بیداری میں دیکھا جا سکتا ہے؟ اور اس معاملے کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: جی ہاں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کے بعد بیداری کی حالت میں دیکھنا ممکن ہے بلکہ بعض صالحین کے ساتھ یہ واقعہ پیش بھی آیا ہے، اور عقل یا شرع میں اس کی کوئی ممانعت نہیں پائی جاتی۔ اس پر امام بخاری کی یہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے:

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ عنقریب مجھے بیداری میں بھی دیکھے گا، کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا۔"

سوال:5 امتِ مسلمہ میلادِ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم مناتی ہے، لیکن کچھ لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بدعت ہے، تو اس کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: تمام اسلامی ممالک اور شہروں کے مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلاد کا جشن مناتے چلے آئے ہیں، اور اس کی اصل قرآن، سنت، علماء کے اقوال اور ان کے عمل سے ثابت ہے۔

اگر اس کی کوئی شرعی اصل نہ ہوتی تو بھی شریعت کا اس پر خاموش رہ جانا ہی اس کے جواز کے لیے کافی تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد کا جشن مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے منایا گیا، جیسے روزہ رکھنا، لونڈی آزاد کرنا، کھانا کھلانا، ذکر وصلوٰۃ کا اہتمام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل کا سننا اور قرآن کی تلاوت کرنا۔

اور اس وجہ سے کہ میلاد کا جشن پہلی صدیوں میں آج کی صورت میں موجود نہ تھا، اسے ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس کی اصل شریعت میں موجود ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کا موجودہ مصحف اپنی علامات، اعراب، آیات کی نمبرنگ، رکوعات، اور نقش ونگار کے ساتھ ابتدائی دور میں موجود نہ تھا، پھر بھی وہ جائز ہے۔ اور تراویح کی جماعت بھی اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس صورت میں نہ تھی۔

رہا بعض علماء کا میلاد کے جشن پر انکار، تو وہ اصل میلاد پر نہیں بلکہ اس میں شامل بعض منکرات جیسے ساز و موسیقی، کھیل تماشے، یا مردوں اور عورتوں کا اختلاط دیکھ کر ہوتا ہے۔

اور ہم بھی ان تمام منکرات کے مخالف ہیں، چاہے وہ میلاد کے موقع پر ہوں یا کسی اور موقع پر۔

سوال: 6 سورہ نساء کی آیت ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا

(النساء: ۶۴) کا حکم کیا آج بھی باقی ہے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ختم ہو گیا؟

جواب: اس آیت کا حکم بلاشبہ قیامت تک باقی ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑے وسیلہ ہیں اور سراسر رحمت ہیں۔

یہ آیت مطلق ہے، اس کی کوئی نصی یا عقلی قید موجود نہیں، اس لیے اس کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ دنیوی کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کا اصول ہے کہ دلیل کے بغیر عموم کو خاص نہیں کیا جاتا، بلکہ اصل یہی ہوتا ہے کہ مطلق حکم جاری رہے جب تک کہ اس کی کوئی قید یا تخصیص نہ ملے۔

اسی آیت سے اکثر فقہاء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک کی زیارت کے استحباب پر دلیل لی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے احیاء العلوم میں ذکر کیا ہے۔

امیر المؤمنین ابو جعفر منصور نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: "قبلہ کی طرف رخ کر کے دعا کروں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف؟"

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "تم ان سے اپنا منہ کیوں موڑو؟ وہ تمہاری اور تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا وسیلہ ہیں۔ قیامت کے دن اللہ کی طرف۔ بلکہ ان کی طرف رخ کرو، اور ان کے ذریعے شفاعت طلب کرو تاکہ اللہ ان کی شفاعت کو قبول فرمائے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ...﴾

پس ایسے بزرگوں کو ہمارے لیے نمونہ ہونا چاہیے۔

سوال 7: کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی ان کے وسیلے سے دعا کرنا جائز ہے؟

جواب: توسّل لغت میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی چیز تک رسائی حاصل کی

جائے یا کسی کے قریب ہوا جائے۔

شرعی اصطلاح میں توسّل اس نیکی یا برکت والے وسیلے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے، چاہے وہ نیک اعمال ہوں یا مقدس ہستیاں۔

توسّل کا جواز قرآن، سنت، سلف صالحین کے اقوال وافعال سے ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دو جگہ وسیلہ کو ذکر کیا:

پہلی جگہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

ترجمہ کنزالایمان: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو اور اس کی راہ میں کوشش کرو اس امید پر کہ مراد پاؤ۔

[المائدۃ:35]

دوسری جگہ:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَى رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ﴾

ترجمہ کنزالایمان: یہ جن کو پکارتے ہیں خود اپنے رب کے پاس وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں کہ ان میں کون زیادہ قریب ہو جائے اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔[الاسراء:57]

کئی احادیث میں صالحین کے وسیلے کا ذکر ہے، جیسے حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں ایک نابینا شخص کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات کے وسیلے سے دعا کا طریقہ بتایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی لوٹا دی۔

اسی طرح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب قحط سالی ہوتی تو حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے دعا کرتے اور بارش نازل ہوتی۔

اور سلف صالحین کے اقوال میں توسّل، تبرک، استمداد اور استعانت سب جائز بلکہ مستحب ہیں، کیونکہ یہ سب اللہ کی طرف وسیلہ ہی کے مختلف انداز ہیں۔

سوال 8: اللہ کے بندوں سے مدد مانگنے اور ان اسباب کو اختیار کرنے کا کیا حکم ہے جنہیں اللہ نے مخلوق کے لیے سبب بنایا ہے؟ اور اس کی کیا دلیلیں ہیں؟

جواب: استعانت اور استمداد کا مطلب ہے مدد اور سہارے کا طلب کرنا۔ ساری دنیا اور اس کے ذرات حقیقت میں ہر لمحہ اللہ ہی سے مدد لیتے ہیں، کیونکہ سب اللہ کے محتاج ہیں اور اللہ ہی کے قائم رکھنے سے قائم ہیں۔

اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس نے کائنات کو قائم رکھنے، اس کی مدد اور اعانت کے لیے کچھ اسباب پیدا کیے ہیں، جو اس نے خود بنائے ہیں۔ پس ہم جیسے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ ہی سچا اور واحد مددگار ہے، ویسے ہی ہم یہ بھی ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ ہی ان اسباب کا خالق ہے جن سے دنیا اور اس کی موجودات قائم ہیں، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور یہ سب فنا ہو جائیں۔

پس جب مسلمان اللہ کی مخلوق سے استعانت و استمداد کرتا ہے تو وہ اس ایمان کے ساتھ کرتا ہے کہ حقیقی مددگار، مالک اور خالق صرف اللہ ہی ہے، اور جس سے مدد مانگی گئی وہ محض ایک سبب ہے جس میں بذاتِ خود نفع یا نقصان پہنچانے کی کوئی طاقت نہیں، جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔

اسی لیے جب کوئی مسلمان بیماری کے وقت دوا لیتا ہے تو وہ کہتا ہے: "اللہ ہی شفا دینے والا ہے"۔ چنانچہ دوا کو بطور سبب اختیار کرنا عقلمند کے لیے قابلِ انکار نہیں، بشرطیکہ اسے محض ایک سبب سمجھا جائے۔

اسی طرح جب کوئی مسلمان اللہ کی مخلوق میں سے کسی چیز یا شخص کو بطور سبب مدد کے لیے اختیار کرے، تو وہ شرک نہیں بلکہ جائز عمل ہے، اور ایسے مسلمان کے بارے میں حسنِ ظن رکھنا واجب ہے۔

استعانت، استمداد اور استغاثہ تینوں امور قرآن وسنت سے ثابت اور مشروع ہیں۔ جو انکار کرتا ہے، وہ خود اپنے قول کے خلاف عمل کرتا ہے، کیونکہ ہر انسان اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں، اشیاء اور آلات سے مدد لیتا ہے۔

لوگوں سے مدد لینا مجازی وسببی ہوتا ہے، اور اللہ سے مدد لینا حقیقی، کیونکہ ہر سبب کو پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔

قرآن سے اس کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (سورہ المائدہ:2)

ترجمہ کنزالایمان: اور نیکی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ دو۔

پس اللہ تعالیٰ ہمیں بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا حکم دیتا ہے۔ اگر مسلمان بہت سے دنیوی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے مشرک نہیں بنتے تو وہ دینی یا دنیوی امور میں کسی سے مدد لے کر کیسے مشرک ہو سکتے ہیں؟ کیا تعاون اور استعانت کے درمیان کوئی ایسا فرق ہے جو شرک کا سبب بنے؟

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاجْعَلْ لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي۔ هَارُونَ أَخِي۔ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي۔ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي (سورہ طٰہٰ:29-32)

ترجمہ کنز الایمان: اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر مقرر کر۔ ہارون میرے بھائی کو۔ اس کے ذریعے میری کمر مضبوط کر۔ اور اسے میرے کام میں شریک کر۔

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا مددگار بنانے کی دعا کر رہے ہیں۔ کیا یہ اپنے بھائی سے استعانت اور استمداد نہیں؟

اسی طرح ذوالقرنین کا قول:

فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا

(سورہ الکہف:95)

ترجمہ کنز الایمان: تو میری مدد کرو زور کے ساتھ کہ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک آڑ بنادوں۔

ذوالقرنین نے ترک قوم سے مدد مانگی، ان کے کاریگروں، آلات اور محنت کے ذریعے ایک مضبوط دیوار بنائی، جو یاجوج وماجوج کو روکے۔

یہ دیوار دونوں طرف کی استعانت سے بنی، پہلے ترک قوم نے ذوالقرنین سے مدد مانگی، پھر ذوالقرنین نے ان سے مدد لی تاکہ وسائل مہیا ہوں۔

حقیقت میں یہ مدد بھی رب کی مدد ہی ہے، جو اسباب کے ذریعے ظاہر ہوئی۔

اور سنت سے اس کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہے:

وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ (رَوَاهُ مُسْلِم)

اللہ بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

تو دیکھو کہ صاحبِ جوامع الکلم (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک ہی سیاق میں حقیقت اور مجاز دونوں کو بیان فرما دیا۔

پس بندے کے لیے اللہ کی مدد تو حقیقت پر مبنی ہے، اور بندے کی بندے کے لیے مدد مجازی ہے، اس لحاظ سے کہ اللہ ہی بندے کو دوسرے بندے کا مددگار، پشت پناہ اور معاون بناتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقوقِ راستہ کے بیان میں فرمان:

وَتُغِيثُوا الْمَلْهُوفَ، وَتَهْدُوا الضَّالَّ (حدیث)

اور فریاد رس کی فریاد رسی کرو، اور گمراہ کو راستہ دکھاؤ۔

پس آپ نے فریاد رسی کو بندے کی طرف منسوب فرمایا اور اُسے اس کا فاعل قرار دیا، اور بندوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ترغیب دی۔

اور اس باب میں بہت سی احادیث اور آثار وارد ہوئے ہیں، نیز علما کے اقوال بھی بکثرت موجود ہیں جنہیں شمار کرنا دشوار ہے۔

سوال: 9 تبرک کا کیا حکم ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں؟

جواب: جان لو کہ تبرک دراصل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس چیز کے وسیلے سے تقرب حاصل کرنا ہے جس سے تبرک حاصل کیا جا رہا ہو، چاہے وہ کوئی اثر (نشانی) ہو، جگہ ہو یا کوئی شخص ہو۔

رہی بات شخصیات کی، تو ان سے تبرک کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے فضل و قربِ الٰہی پر ایمان ہوتا ہے، اور ان کی ذاتی تاثیر کا عقیدہ نہیں ہوتا بلکہ یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ کسی نفع و ضرر کے مالک نہیں، سب کچھ اللہ کے حکم سے ہے۔

اور آثار (نشانیوں) کا حال یہ ہے کہ وہ ان بزرگ ہستیوں سے نسبت کی وجہ سے قابلِ احترام اور بابرکت سمجھے جاتے ہیں۔

اور جگہیں خود اپنی ذات سے افضل نہیں ہوتیں بلکہ ان میں جو خیر اور برکت والے کام واقع ہوتے ہیں، جیسے نماز، روزہ اور عبادات جنہیں اللہ کے نیک بندے ادا کرتے ہیں، ان کی وجہ سے وہ جگہیں مبارک بن جاتی ہیں۔ کیونکہ ان میں اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، فرشتے حاضر ہوتے ہیں، اور سکینہ چھا جاتا ہے، یہی وہ برکت ہے جو ہم ان جگہوں سے اللہ سے مانگتے ہیں۔

پس تبرک کا ثبوت قرآن وسنت سے ثابت ہے۔

قرآن سے دلیل:

اللہ تعالیٰ نے تابوت کے بارے میں فرمایا:

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ﴾ (البقرۃ:248)

ترجمہ کنز الایمان: اور ان سے اُن کے نبی نے فرمایا: اُس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس تابوت آئے گا، اس میں تمہارے رب کی طرف سے دل جمعی ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں موسیٰؑ اور ہارون کے گھر والوں کی چھوڑی ہوئی، اسے فرشتے اٹھائے ہوئے آئیں گے۔

خلاصہ یہ کہ یہ تابوت بنی اسرائیل کے پاس تھا، وہ اس سے نصرت مانگتے اور اس میں موجود آثار سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توسل کرتے تھے، یہی تبرک ہے جس کی ہم بات کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ﴾

مفسرین جیسے امام ابن کثیر، امام قرطبی، امام سیوطی، امام طبری رحمہم اللہ نے ذکر کیا کہ ان باقیات میں حضرت موسیٰ کی عصا، کچھ کپڑے، حضرت ہارون کی چپلیں، تورات کے کچھ تختیاں اور ایک برتن تھا۔ ان اشیاء سے درج ذیل معانی ثابت ہوتے ہیں:

نیک لوگوں کے آثار سے توسل

ان کی حفاظت

ان سے برکت حاصل کرنا

اسی طرح بعض اوقات کافروں اور فاسقوں سے عذاب بھی اس لیے ٹال دیا جاتا ہے کہ ان میں کچھ مؤمنین موجود ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ (الفتح:25)

ترجمہ کنز الایمان: اور اگر کچھ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جنہیں تم نے نہ جانا کہ کہیں تم انہیں روند ڈالو تو تمہیں ان کی طرف سے انجانے میں ضرر پہنچے، کہ اللہ اپنی رحمت میں داخل کرے جسے چاہے، اگر وہ الگ ہوتے تو ہم ضرور کافروں کو ان میں دردناک عذاب دیتے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا قول:

﴿وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ﴾ (مریم:31)

ترجمہ کنز الایمان: اور مجھے برکت والا کیا جہاں کہیں ہوں۔

سنت سے ثبوت:

صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے بارے میں روایت ہے:

((فَوَاللهِ مَا تَنَخَّمَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم نُخَامَةً إِلَّا وَقَعَتْ فِي كَفِّ رَجُلٍ مِنْهُمْ، فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهُ وَجِلْدَهُ)) (صحیح بخاری)

اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی لعاب مبارک نکالا (تھوکا)، تو وہ کسی صحابی کے ہاتھ میں گرا، اور اس نے اسے اپنے چہرے اور جسم پر مل لیا۔

امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ صالحین کے طاہر فضلات (جیسے بال، پسینہ، تھوک) سے تبرک جائز ہے۔"

ایک اور حدیث بخاری شریف میں:

((عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، قَالَ: قَدِمْتُ الْمَدِينَةَ، فَلَقِيَنِي عَبْدُ اللهِ بْنُ سَلَامٍ، فَقَالَ لِي: انْطَلِقْ إِلَى الْمَنْزِلِ فَأَسْقِيَكَ فِي قَدَحٍ شَرِبَ فِيهِ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَتُصَلِّي فِي مَسْجِدٍ صَلَّى فِيهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَانْطَلَقْتُ مَعَهُ، فَسَقَانِي سَوِيقًا، وَأَطْعَمَنِي تَمْرًا، وَصَلَّيْتُ فِي مَسْجِدِهِ)) (صحیح بخاری)

ابو بردہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں مدینہ آیا تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چلو میں تمہیں اس پیالے میں مشروب پلاؤں گا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا تھا، اور تم اس مسجد میں نماز پڑھو گے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، چنانچہ میں ان کے ساتھ چلا، انہوں نے مجھے سویق پلایا، کھجور کھلائی اور میں نے اس مسجد میں نماز پڑھی۔

اس حدیث سے بھی تبرک کا جواز ثابت ہوتا ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیالے اور نماز پڑھنے کی جگہ سے تبرک حاصل کیا گیا۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں انبیاء کرام اور دیگر نیک لوگوں، اور مقدس جگہوں اور چیزوں جیسے قرآن اور شعائرِ اسلام سے تبرک ثابت ہونے پر بہت سی دلائل موجود ہیں۔

سوال 10: کسی مسلمان کو کافر قرار دینے کا کیا حکم ہے؟ اور اس مسئلہ میں امام احمد رضا خان کا موقف کیا ہے؟

جواب: شریعت کے دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بندہ جب کلمہ شہادتین (یعنی "لا اِلٰہ اِلا اللہ محمد رسول اللہ") کو زبان سے ادا کرے تو وہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے، اور دنیا میں اس کا خون، مال اور عزت حرام ہو جاتی ہے۔ اور آخرت اہل ایمان کے لیے عزت و کرامت کا مقام ہے، جہاں مؤمن اپنے ایمان کی وجہ سے نجات پاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر دوزخ کو حرام کر دیا ہے جو لا اِلٰہ اِلا اللہ کہے اور صرف اللہ کی رضا کا طالب ہو۔"

اور اگر کوئی مسلمان گناہگار ہو اور اپنے گناہوں کی وجہ سے دوزخ کا مستحق ہو بھی جائے تو وہ دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا، بلکہ اسے اس کلمۂ طیبہ، یعنی کلمہ توحید کے ذریعے

نجات ملے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دوزخ سے وہ شخص نکل آئے گا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا، اگرچہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی خیر (نیکی) ہو۔ اور وہ بھی نکل آئے گا جس کے دل میں گندم کے دانے کے برابر خیر ہو۔ اور وہ بھی جس کے دل میں ذرہ برابر خیر ہو۔"

علماء کا اصول ہے: "جس کے اسلام کا ثبوت یقینی طور پر ہو، وہ صرف یقینی دلیل ہی سے اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔"

لہٰذا مسلمانوں کو بغیر روشن اور یقینی دلیل کے کسی کو کافر قرار دینے سے سختی سے بچنا چاہیے، کیونکہ کسی پر ارتداد کا حکم دینا بہت سے بڑے اور خطرناک اثرات رکھتا ہے، جو فرد اور پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جہاں تک ہو سکے، تکفیر سے بچنا چاہیے، کیونکہ نماز پڑھنے والوں اور توحید کا اقرار کرنے والوں کے خون کو حلال سمجھنا خطرناک غلطی ہے، اور یہ غلطی کہ ہزار کافروں کو زندہ چھوڑ دیا جائے، اس غلطی سے کہیں بہتر ہے کہ ایک مسلمان کا خون ناحق بہا دیا جائے۔"

بلاشبہ شریعت مطہرہ نے مسلمان پر بغیر واضح دلیل کے کفر کا حکم لگانے سے سختی سے خبردار کیا ہے۔

ایسی دلیل ہو جو بالکل واضح اور غیر مشتبہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذَٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (سورۃ النساء:94)

ترجمہ کنزالایمان: اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تحقیق کرلیا کرو، اور جو تمہیں سلام کرے اسے یہ نہ کہو کہ تُو مسلمان نہیں، تم دنیوی مال چاہتے ہو، تو اللہ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں، تم پہلے ایسے ہی تھے تو اللہ نے تم پر احسان کیا تو خوب تحقیق کرلو، بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: "فَتَبَيَّنُوا" یعنی ایسے شخص کو قتل کرنے میں جلدی نہ کرو جس کے حال میں تمہیں شبہ ہو، اور تمہیں اس کے اسلام یا کفر کی حقیقت معلوم نہ ہو، اور نہ ہی جلدی کرو کہ اس شخص کو قتل کردو جس کے بارے میں تمہیں اشتباہ ہو، اور کسی کو قتل کرنے میں اس وقت تک پیش قدمی نہ کرو جب تک کہ تمہیں یقین نہ ہو جائے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کررہا ہے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو خبردار فرمایا، چنانچہ فرمایا:

أَيُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِأَخِيهِ: يَا كَافِرُ. فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا

ترجمہ: جو کوئی اپنے مسلمان بھائی سے کہے: اے کافر! تو ان دونوں میں سے ایک پر یہ کلمہ لوٹ آتا ہے۔

اور ایک اور روایت میں صحیحین اور دیگر کتب میں آیا ہے:

مَنْ دَعَا رَجُلًا بِالْكُفْرِ أَوْ قَالَ: عَدُوَّ اللَّهِ، وَلَيْسَ كَذَٰلِكَ،

إِلَّا حَارَ عَلَيْهِ

ترجمہ: جس نے کسی شخص کو کافر یا دشمنِ خدا کہا، حالانکہ وہ ایسا نہ ہو، تو یہ بات اسی پر لوٹ آتی ہے۔

اور ایک روایت میں ہے:

فَقَدْ كَفَرَ أَحَدُهُمَا

ترجمہ: ان دونوں میں سے ایک کافر ہو گیا۔

یہ احادیث اور ان جیسے دیگر اقوال سخت تنبیہ ہیں اور تکفیر میں جلد بازی سے روکنے کے لیے بہت بڑا واعظ و نصیحت ہیں۔

امام طحاوی نے روایت کیا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے دیگر مشائخ نے فرمایا:

کسی شخص کو ایمان سے اس وقت تک خارج نہ کیا جائے گا جب تک وہ اس چیز کا انکار نہ کرے جو اسے ایمان میں داخل کرنے کا سبب بنی، اور پھر صرف اسی چیز کو مرتد قرار دیا جائے گا جس کا یقینی علم ہو کہ وہ ارتداد ہے، اور جو چیز مشتبہ ہو کہ وہ ارتداد ہے یا نہیں، اس پر ارتداد کا حکم نہیں لگایا جائے گا؛ کیونکہ ثابت شدہ اسلام کسی شبہ سے زائل نہیں ہوتا، اور اسلام غالب ہے، اور عالم کے لیے یہ مناسب ہے کہ جب اس کے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش ہو تو وہ اہل اسلام کی تکفیر میں جلدی نہ کرے، اگر چہ وہ اہل کفر کے اسلام کو درست سمجھتا ہو۔

مسلمان کی تکفیر سے اس کا خون اور مال مباح ہو جاتا ہے، لہٰذا اس میں ٹھہراؤ اور احتیاط ضروری ہے، اور ایسے شخص سے زبان کو روکنا چاہیے جو" لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہے اور اس کے برخلاف کوئی بات نہ کرے، کیونکہ تکفیر میں خطرہ ہے، جبکہ خاموشی میں کوئی خطرہ نہیں۔

تکفیر کے مسئلہ میں امام احمد رضا خان کا مؤقف

امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن نے فرمایا:

"ہمارے ائمہ کا اصول ہے کہ اگر کسی کلام میں کفر کے ننانوے احتمال ہوں اور اسلام کا ایک احتمال ہو، تو جب تک اس کے خلاف ثابت نہ ہو، کلام کو اسلام پر محمول کرنا واجب ہے۔"

اور امام علی القاری کی کتاب شرح الفقہ الاکبر سے نقل کیا کہ:

"انہوں نے ذکر کیا کہ اگر کفر سے متعلق کسی مسئلہ میں ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال کفر کے انکار کا ہو، تو مفتی اور قاضی کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ انکارِ کفر والے احتمال پر عمل کریں۔"

اور خلاصۃ الفتاویٰ، جامع الفصولین، محیط برہانی، فتاویٰ ہندیہ اور دیگر کتابوں سے نقل کیا:

"اگر کسی مسئلہ میں کچھ وجوہات ایسی ہوں جو تکفیر کا تقاضا کریں اور ایک وجہ ایسی ہو جو تکفیر سے مانع ہو، تو مفتی اور قاضی پر لازم ہے کہ وہ اسی وجہ کی طرف مائل ہو، اور کفر کا فتویٰ نہ دے، تا کہ مسلمان کے بارے میں حسنِ ظن رکھا جائے۔ پھر اگر قائل کی نیت وہی وجہ ہو جو تکفیر سے مانع ہے تو وہ مسلمان ہے، اور اگر اس کی نیت وہ نہ ہو، تو مفتی کا اس کے کلام کو کفر سے خالی احتمال پر محمول کرنا اس کے حق میں فائدہ مند نہ ہوگا۔"

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں دین میں بصیرت عطا فرمائے، اور درود وسلام اور رحمت کاملہ نازل ہو ہمارے نبی اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر، اور ان کے تمام اہل بیت وصحابہ پر۔

سوال 11: قبروں کی زیارت کا کیا حکم ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کا کیا حکم ہے؟ اور کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے نیک لوگوں کی قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنا جائز ہے؟

جواب: فقہاء کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ مردوں کے لیے قبروں کی زیارت مندوب ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنِّي كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ.

اور اس لیے بھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع میں مردوں کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے اور یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ، وَأَتَاكُمْ مَا تُوعَدُونَ، غَدًا مُؤَجَّلُونَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَهْلِ بَقِيعِ الْغَرْقَدِ"

رہا معاملہ عورتوں کا، تو جمہور علماء کے نزدیک عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت مکروہ ہے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ

"لَعَنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَوَّارَاتِ الْقُبُورِ."

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیادہ زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں میں دل کی نرمی، جزع وفزع اور مصیبتوں پر کم صبر ہوتا ہے، اور یہ سب چیزیں چیخ وپکار کا سبب بن سکتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت اور اس کے لیے سفر کرنا تو اعظم

المندوبات میں سے ہے، بلکہ واجب کے قریب ہے۔ بعض لوگوں نے درج ذیل حدیث کو سمجھنے میں خطا کی ہے:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى۔

یعنی سفر صرف تین مسجدوں کے لیے کیا جائے: مسجدِ حرام، میری یہ مسجد، اور مسجد اقصیٰ۔

اور اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے سفر کرنا ناجائز ہے، بلکہ اسے معصیت کا سفر شمار کرتے ہیں، حالانکہ یہ استدلال باطل فہم پر مبنی ہے، کیونکہ یہ حدیث ایک خاص باب میں وارد ہوئی ہے اور اس کا تعلق کسی اور باب میں نہیں۔

اس حدیث میں "إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ" کا اسلوب اہلِ لغت کے ہاں "استثناء" کا معروف اسلوب ہے، جس میں مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ ہوتا ہے۔ مستثنیٰ تو حدیث میں مذکور ہے یعنی "تین مسجدیں"، مگر مستثنیٰ منہ مذکور نہیں، اس لیے اسے مقدر ماننا پڑے گا۔

اور اللہ کے فضل سے ہمیں معتبر روایات سے یہ بات ملی ہے کہ مستثنیٰ منہ کی وضاحت بھی حدیث میں دیگر جگہ پر آئی ہے، جیسے کہ امام احمد نے شہر بن حوشب کے ذریعے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا يَنْبَغِي لِلْمَطِيِّ أَنْ تُشَدَّ رِحَالُهُ إِلَى مَسْجِدٍ يُبْتَغَى فِيهِ الصَّلَاةُ غَيْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى، وَمَسْجِدِي هَذَا"

سواریوں کو کسی ایسی مسجد کی طرف سفر کے لیے تیار نہیں کرنا چاہیے جس میں نماز حاصل کرنا مقصود ہو، سوائے مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور میری اس مسجد کے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''شہر بن حوشب حسن الحدیث ہیں، اگر چہ ان میں کچھ ضعف ہے''۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنَا خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ، وَمَسْجِدِي خَاتَمُ مَسَاجِدِ الْأَنْبِيَاءِ، أَحَقُّ الْمَسَاجِدِ أَنْ يُزَارَ وَتُشَدَّ إِلَيْهِ الرِّحَالُ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ، وَمَسْجِدِي، صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ۔

ترجمہ: میں خاتم النبیین ہوں، اور میری مسجد انبیاء کی مساجد میں آخری ہے۔ ان مساجد میں سب سے زیادہ حق رکھتی ہیں کہ ان کی زیارت کی جائے اور ان کی طرف سواری کی جائے: مسجد حرام اور میری یہ مسجد۔ میری مسجد میں ایک نماز دوسری تمام مسجدوں میں ہزار نمازوں سے افضل ہے، سوائے مسجد حرام کے۔

پس یہ تمام کلام ''مساجد'' کے بارے میں ہے تا کہ امت کو یہ بتا دیا جائے کہ ان تین مساجد کے سوا باقی مساجد کا کوئی خاص امتیاز نہیں، اس لیے ان کے لیے سفر کرنے کی خاص ضرورت نہیں۔ باقی مقابر (قبریں) اس حدیث کے موضوع میں داخل ہی نہیں، اس لیے ان کو اس حدیث میں داخل کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان لگانے کے مترادف ہے۔

اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت مطلوب ہے، بلکہ بہت سے علماء نے اپنی مناسکِ حج کی کتابوں میں اسے مستحب قرار دیا ہے، اور اس پر کئی احادیث دلالت کرتی ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي۔

"جو شخص محض میری زیارت کے لیے آئے، یعنی اس کا کوئی اور مقصد نہ ہو، تو میرے ذمے ہے کہ میں قیامت کے دن اس کا شفیع بنوں"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِي فِي مَمَاتِي كَانَ كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي۔

"جس نے حج کیا اور میری قبر کی زیارت کی، گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ جَاءَنِي زَائِرًا لَا يُعْلَمُ لَهُ حَاجَةٌ إِلَّا زِيَارَتِي كَانَ حَقًّا عَلَيَّ أَنْ أَكُونَ لَهُ شَفِيعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

جو شخص میرے پاس محض زیارت کے لیے آئے اور اس کی کوئی اور حاجت نہ ہو سوائے میری زیارت کے، تو میرے ذمے ہے کہ قیامت کے دن میں اس کا شفیع ہوں گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ زیارت کی احادیث کے بہت سے طرق ہیں جو ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں، جیسا کہ امام مناوی نے حافظ ذہبی سے "فیض القدیر" میں نقل کیا ہے، اور بعض علماء نے ان احادیث کو صحیح قرار دیا ہے یا ان کے صحیح ہونے کو نقل کیا ہے، جیسے امام

سبکی، ابن السکن، امام عراقی، قاضی عیاض رحمہم اللہ وغیرہ۔ اور یہی بات ملا علی قاری اور امام خفاجی رحمہا اللہ نے "نسیم الریاض" میں کہی۔ یہ سب حدیث کے بڑے حفاظ اور ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اور یہی کافی ہے کہ ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم اور دیگر جلیل القدر علماء وائمہ دین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو مشروع قرار دیا ہے، جیسا کہ ان کے شاگردوں نے ان کی معتمد فقہی کتب میں نقل کیا ہے۔ اور جب حدیث ضعیف ہو تب بھی اگر اس پر عمل اور فتویٰ موجود ہو تو وہ قابلِ قبول ہو جاتی ہے، جیسا کہ اصولیوں اور محدثین کا معروف قاعدہ ہے۔

سوال 12: مسلمان کا کسی صوفی طریقے میں داخل ہونا کیسا ہے؟ اور یہ صوفی سلسلے مختلف کیوں ہیں، جبکہ تصوف تو زہد، ذکر اور اللہ کی طرف احسن طریقے سے سلوک کا نام ہے، تو مسلمان صرف قرآن وسنت سے آداب وسلوک کیوں نہ سیکھ لے؟

جواب: صوفی طریقے مختلف مشارب اور مناہج رکھتے ہیں، ان میں سے جو طریقے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہوں، وہ قابل قبول ہیں، اور جو مخالف ہوں، وہ مردود ہیں۔

تصوف کی اصل یہ ہے کہ انسان کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ شرعی احکام کو صحیح طریقے سے اپنائے، اور اپنے نفس سے بری صفات کو نکال کر اچھے اخلاق کو اختیار کرے۔ اسی لیے بعض اہل علم نے تصوف کی تعریف یہ کی ہے کہ علم پر عمل کرنا، اور یہ کہ برے اخلاق کو چھوڑ کر اچھے اخلاق اپنانا۔

تصوف کے بڑے بڑے اہل علم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی صوفی کا حال یا قول اُس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتا جب تک وہ قرآن وسنت کے مطابق نہ ہو۔ البتہ ان میں سے کچھ لوگوں نے ان اصولوں سے انحراف کیا اور ایسے بدعات ایجاد کیں جن کی

اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ یہ عیب بدعت کرنے والوں پر ہے، نہ کہ ان سچے صوفیاء پر جو قرآن وسنت پر قائم ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی اسلامی جماعت ایسی نہیں جس میں کچھ افراد گمراہ نہ ہوئے ہوں، لیکن یہ درست نہیں کہ برے افراد کا قصور نیک افراد پر بھی ڈال دیا جائے۔

آج کے زمانے میں تصوف کو دو گروہوں نے نقصان پہنچایا ہے:

پہلا گروہ: وہ لوگ جنہوں نے صوفیاء کا نام لیا اور غیر شرعی اعمال کے ذریعے انہیں بدنام کیا۔

دوسرا گروہ: وہ لوگ جنہوں نے صرف گمراہ صوفیوں کو دیکھا اور نیک و بد سب پر حملہ کر دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى

ترجمہ کنزُ العِرفان: اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

یقیناً آج بھی صوفیوں میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیدھے راستے پر ہیں اور صحیح طریقے سے تصوف کو اپنائے ہوئے ہیں۔ جو ان کو ڈھونڈے گا وہ عظیم خیر پا لے گا، اور اگر کسی کو وہ نہ ملیں تو شریعتِ اسلامیہ کی واضح تعلیمات میں اُس کے لیے کافی راہنمائی ہے۔

شیخ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ مرید یا مریض کے لیے وہ طریقہ اختیار کرے جو اس کی حالت کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہو۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ ہر شخص کو اس کی طبیعت کے مطابق ایسی نصیحت فرماتے جو اسے اللہ سے قریب کر دے۔ کوئی شخص آ کر کہتا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی ایسی بات بتائیں جو مجھے اللہ کے غضب سے دور کرے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: "غصہ نہ کرو"۔ دوسرا آ کر کہتا: مجھے کوئی بات بتائیں جسے میں مضبوطی سے تھام لوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

"تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہے"۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی کوئی کثرت سے قیام اللیل کرتا تھا، کوئی قرآن کی تلاوت زیادہ کرتا تھا، کوئی جہاد میں بڑھا ہوا تھا، کوئی ذکر میں مشغول، اور کوئی صدقہ خیرات میں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوسرے اعمال چھوڑ دیتے تھے، بلکہ وہ ایک خاص عبادت کو زیادہ اختیار کرتے تھے جو اُنہیں اللہ تعالیٰ سے قریب کرتی تھی، اور اسی بنا پر جنت کے دروازے بھی مختلف رکھے گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لِكُلِّ أَهْلِ عَمَلٍ بَابٌ مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، يُدْعَوْنَ بِذَلِكَ الْعَمَلِ، وَلِأَهْلِ الصِّيَامِ بَابٌ يُدْعَوْنَ مِنْهُ، يُقَالُ لَهُ: الرَّيَّانُ

ہر عمل کرنے والوں کے لیے جنت کے دروازے ہوں گے جن سے ان کو ان کے عمل کی بنیاد پر بلایا جائے گا، اور روزہ داروں کے لیے ایک خاص دروازہ ہے جسے "ریّان" کہا جاتا ہے۔

اسی طرح صوفی طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں جو کہ شیخ اور مرید کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ کوئی صوفی روزے پر زیادہ توجہ دیتا ہے، کوئی قرآن پر، مگر دوسرے اعمال کو ترک نہیں کرتا۔

آخر میں ہم ان لوگوں کو جواب دیتے ہیں جو کہتے ہیں کہ جب قرآن وسنت میں سب کچھ موجود ہے تو آدابِ سلوک اور نفس کی تربیت ان سے براہ راست کیوں نہ سیکھ لی جائے؟ بظاہر یہ بات اچھی لگتی ہے، مگر حقیقت سے بہت دور ہے، کیونکہ ہم نے نماز کے ارکان، سنتیں، مکروہات صرف قرآن وحدیث پڑھ کر نہیں سیکھیں بلکہ ایک علم سیکھا جسے "فقہ" کہا جاتا ہے، جو فقہاء نے قرآن وسنت سے نکال کر مرتب کیا۔

اسی طرح کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو نہ قرآن میں ہیں نہ سنت میں صاف صاف

موجود ہیں، بلکہ انہیں شیخ سے بالمشافہ سیکھنا ضروری ہوتا ہے، جیسے علمِ تجوید۔ بالکل اسی طرح علمِ تصوف بھی ایک علم ہے جو صوفیاء کرام نے حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے دور (چوتھی صدی) سے آج تک مرتب کیا ہے۔

سوال 13: کیا بعض نیک بندوں کے لیے ان کی زندگی میں کرامات واقع ہوتی ہیں، اور کیا یہ کرامات ان کی وفات کے بعد برزخی زندگی میں بھی جاری رہتی ہیں؟

جواب: جی ہاں، ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اولیاء کرام کی کرامات حق ہیں، یعنی ان کا واقع ہونا ممکن بھی ہے اور حقیقت میں پیش بھی آئیں ہے، چاہے ان کی زندگی میں ہو یا وفات کے بعد۔ اور اس کا انکار صرف وہی شخص کرتا ہے جس کی بصیرت اندھی ہو چکی ہو اور جس کا دل بگڑ چکا ہو۔

کرامات کے وقوع کا ثبوت قرآن وحدیث دونوں میں موجود ہے۔

مثلاً قرآن کریم میں حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں فرمایا:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران: 37)

ترجمہ کنزالایمان: جب کبھی زکریا اس کے پاس محراب میں آتے، اس کے پاس کچھ رزق پاتے، کہتے اے مریم یہ تجھے کہاں سے آیا؟ وہ بولی یہ اللہ کے پاس سے ہے، بے شک اللہ جسے چاہے بے گنتی دے۔

مفسرین نے فرمایا: حضرت مریم کے پاس گرمیوں میں سردیوں کے پھل اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل پائے جاتے تھے، اور یہ پھل ایسی راہ سے آتے تھے جو عام لوگوں کے لیے معمول نہ تھی، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر کرامت تھی۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَهُزِّىٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ ٱلنَّخْلَةِ تُسَٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (مریم:25)

ترجمہ کنز الایمان: اور کُھجور کا تنا اپنی طرف ہلا، تیرے اوپر پکے تازے کھجوریں گریں گی۔

اسی طرح اصحابِ کہف کی داستان بھی کرامت کی دلیل ہے: وہ تین سو نو سال تک بغیر کھانے پینے کے سوتے رہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے جسموں کو بے تکلیف رکھنے کے لیے ان کو دائیں بائیں پلٹایا، سورج کو ان سے ایسے زاویے پر رکھا کہ حرارت اُنہیں نہ لگے، اور یہ سب غیر معمولی باتیں اللہ نے ان کے لیے کیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کی کرامت بھی قرآن میں بیان ہوئی ہے۔

اسی طرح صحابہ، تابعین اور بعد کے اولیاء کی کرامات تواتر کے ساتھ منقول ہیں، جنہیں پوری دنیا میں مشہور کیا گیا۔

مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہ جب مکہ میں قید تھے، وہاں اسیر ہونے کے باوجود ایسے پھل کھاتے جو مکہ میں اُس وقت دستیاب ہی نہ تھے، یہ اُن کی کرامت تھی۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت عاصم رضی اللہ عنہ جب شہید ہوئے تو مشرکین نے ان کا جسم کاٹنے کا ارادہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بھنبھیریوں (زنبوروں) کا ایک بادل بھیج دیا جو اُن کے جسم کی حفاظت پر مامور ہوا، اور یہ واقعہ وفات کے بعد کرامت کی دلیل ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اندھیری رات میں حضرت اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، جب

واپس جانے لگے تو ایک کے عصا سے روشنی نکلنے لگی، اور جب دونوں کی راہیں جدا ہوئیں تو ہر ایک کی لاٹھی سے الگ الگ روشنی نکلنے لگی، اور وہ اسی روشنی میں چلتے رہے۔ یہ واقعہ بھی صحیح بخاری میں موجود ہے۔

اولیاء اللہ کی کرامات کی کوئی حد نہیں:

کچھ ایسے ہوئے جو آگ میں داخل ہوئے اور آگ نے انہیں نقصان نہ پہنچایا، کچھ کے ہاتھ پر مردے زندہ ہوئے، کچھ اہلِ خُطوۃ کہلائے (یعنی جن کی چند قدم میں دور دراز جگہ پہنچنے کی قدرت دی گئی)، کچھ پانی یا ہوا پر چلتے، اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے تابع جنات آتے۔

تنبیہ:

اگر کوئی غیر معمولی بات کسی کافر یا فاسق کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو وہ استدراج ہے لیکن اگر کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو وہ کرامت کہلاتی ہے

سوال 14: میت کے پاس قبر پر قرآن پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اور کیا اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے؟

جواب: حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ میت کے لیے قرآن پڑھنا مستحب ہے، اس لیے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ دَخَلَ الْمَقَابِرَ فَقَرَأَ فِيهَا (يس) خُفِّفَ عَنْهُمْ يَوْمَئِذٍ، وَكَانَ لَهُ بِعَدَدِهِمْ حَسَنَاتٌ." [ذکرہ ابن حجر فی الفتوحات الربانیۃ]

جو شخص قبروں میں داخل ہو اور وہاں سورۃ یٰسین پڑھے، اس دن ان مردوں کے عذاب میں تخفیف کی جاتی ہے، اور اس قاری کو ان مردوں کی تعداد کے برابر نیکیاں عطا کی جاتی ہیں۔

اسی طرح امام احمد، ابو داود اور ابن ماجہ نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اقْرَءُوا عَلَى مَوْتَاكُمْ يس.

"اپنے مردوں پر سورۃ یٰسین پڑھا کرو۔"

علماء نے فرمایا کہ یہ حدیث مطلق ہے، لہٰذا یہ حالتِ نزع اور موت کے بعد دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

امام طبرانی اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا:

"إِذَا مَاتَ أَحَدُكُمْ فَلَا تَحْبِسُوهُ، وَأَسْرِعُوا بِهِ إِلَى قَبْرِهِ، وَلْيُقْرَأْ عِنْدَ رَأْسِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، وَعِنْدَ رِجْلَيْهِ بِخَاتِمَةِ الْبَقَرَةِ فِي قَبْرِهِ."

[رواہ الطبرانی فی الکبیر والبیہقی فی شعب الایمان]

"جب تم میں سے کوئی فوت ہو جائے تو اسے روکے مت رکھو، بلکہ جلدی اسے اس کی قبر تک لے جاؤ، اور اس کے سرہانے سورۃ الفاتحہ اور پاؤں کی طرف سورۃ البقرہ کی آخری آیات پڑھی جائیں۔"

علماء نے فرمایا: سلف صالحین میں سے کئی حضرات نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبروں پر قرآن پڑھا جائے، ان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں جنہوں نے وصیت کی کہ ان کی قبر پر سورۃ البقرہ کی ابتدا اور اختتام پڑھی جائے، اور یہ بھی منقول ہے کہ انصار میں سے جب کوئی فوت ہوتا تو اس کی قبر پر جا کر قرآن پڑھا کرتے تھے۔

علماء نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ انسان اپنے کسی بھی نیک عمل کا ثواب کسی دوسرے کو ہبہ کر سکتا ہے، چاہے وہ نماز ہو یا قرآن خوانی یا کوئی اور عمل۔ اس پر امام دارقطنی کی وہ روایت بھی دلیل ہے جس میں ایک شخص نے عرض کیا:

"یَا رَسُولَ اللّٰہِ، إِنَّهُ كَانَ لِي أَبَوَانِ أَبَرُّهُمَا فِي حَيَاتِهِمَا، فَكَيْفَ لِي بِبِرِّهِمَا بَعْدَ مَوْتِهِمَا؟"

فقال صلی اللہ علیہ وسلم:

"إِنَّ مِنَ الْبِرِّ بَعْدَ الْبِرِّ أَنْ تُصَلِّيَ لَهُمَا مَعَ صَلَاتِكَ، وَأَنْ تَصُومَ لَهُمَا مَعَ صِيَامِكَ." [رواہ الدارقطنی]

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے والدین تھے جن کے ساتھ میں ان کی زندگی میں حسنِ سلوک کرتا تھا، اب ان کی وفات کے بعد میں ان کے ساتھ کس طرح حسنِ سلوک کروں؟" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "برّ بعد البر یہ ہے کہ ان کے لیے نماز پڑھو جیسا کہ تم اپنے لیے نماز پڑھتے ہو، ان کے لیے روزہ رکھو جیسے اپنے لیے رکھتے ہو۔"

لہٰذا جن علماء نے قرآن خوانی کو جائز اور مستحب قرار دیا، ان کا قول ہی راجح اور قوی ہے۔ بلکہ بعض علماء نے تو اس مسئلے کو اجماعی مسئلہ قرار دیا ہے اور اس پر صراحت بھی کی ہے۔ ان علماء میں امام ابن قدامہ مقدسی حنبلی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، جنہوں نے فرمایا: "جو بھی نیکی کا عمل کوئی شخص کرے اور اس کا ثواب کسی مسلمان میت کو ہبہ کردے، تو ان شاء اللہ اسے فائدہ ہوتا ہے۔" پھر فرمایا: "بعض علماء نے کہا: جب قرآن میت کے پاس پڑھا جائے یا اس کا ثواب اسے ہدیہ کیا جائے، تو اس سے قاری کو ثواب ملتا ہے اور میت کو بھی فائدہ ہوتا ہے، گویا وہ وہاں موجود ہے، پس اس کے لیے اللہ کی رحمت کی امید کی جاتی ہے۔ اور ہمارے لیے دلیل وہ ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں، اور یہ کہ یہ مسلمانوں کا اجماع ہے، کیونکہ ہر زمانے اور شہر میں مسلمان جمع ہو کر قرآن پڑھتے اور اس کا ثواب اپنے مردوں کو ہدیہ

کرتے ہیں، اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کیا۔"

اسی طرح شیخ العثمانی الدمشقی الشافعی رحمہ اللہ نے بھی اجماع نقل کیا ہے، ان کے الفاظ ہیں: (ترجمہ) "سب کا اجماع ہے کہ استغفار، دعا، صدقہ، حج اور غلام آزاد کرنے کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور اس کا فائدہ ہوتا ہے، اور قبر پر قرآن پڑھنا مستحب ہے۔"

علماء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ قرآن خوانی کا ثواب میت کو پہنچتا ہے، اور اس کی بنیاد حج کے ثواب کے میت کو پہنچنے پر رکھی ہے، کیونکہ حج میں نماز شامل ہوتی ہے اور نماز میں سورۃ الفاتحہ اور دیگر سورتیں پڑھی جاتی ہیں، پس جب مکمل عمل کا ثواب پہنچ سکتا ہے تو جزوی عمل کا بھی پہنچ سکتا ہے، اور اگر قاری یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن خوانی کا ثواب میت کو عطا کرے، تو اس کے پہنچنے کی امید اور قوی ہو جاتی ہے۔

خلاصہ بحث:

شرعاً کوئی ممانعت نہیں کہ لوگ قرآن کی تلاوت کریں، ختم کریں، اور اس نیک عمل یا دیگر نیک اعمال کا ثواب میت کو ہبہ کریں؛ چاہے یہ میت کے انتقال کے وقت ہو یا اس کے بعد، چاہے گھر میں ہو، مسجد میں یا قبر پر۔ اس بارے میں کئی احادیث وارد ہوئی ہیں جو حالتِ نزع اور اس کے بعد دونوں کو شامل ہیں۔ اس مسئلے پر بہت سے علماء نے مستقل تصنیفات بھی کی ہیں، جن میں امام خلال حنبلی (متوفی ۳۱۱ھ)، حافظ شمس الدین مقدسی حنبلی، اور سید عبداللہ غماری شامل ہیں۔ بلکہ بعض علماء نے تو اس کے مشروع ہونے پر اجماع نقل کیا ہے، اور کسی طرف سے اس پر نکیر منقول نہیں۔

سوال 15: بہت سے شدت پسند اس دلیل سے مسلمانوں کے بہت سے کاموں کو ناجائز قرار دیتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ کام نہیں کیے، تو کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کسی

کام کو ترک کرنا اس کے ناجائز ہونے کی دلیل ہے؟

جواب: امام المتکلمین، علامہ مولانا نقی علی خان (وفات: ۱۲۹۷ھ) نے اپنی کتاب "إذاقة الأثام المانعي عمل المولد والقيام" میں فرمایا ہے: محض ترک اور کسی کام کا واقع نہ ہونا کراہت کی دلیل نہیں ہوتا، کیونکہ ترک کسی اور وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن نے اس کتاب کے حاشیہ میں لکھا ہے: بلکہ جب تک ترک کسی چیز سے قصداً بچنے اور ارادتاً اجتناب کی نیت سے نہ ہو، تو وہ مکلف انسانوں کے افعال میں شمار ہی نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ انسانی قدرت کے تحت آتا ہے، تو اس میں اتباع کیسا؟

امام سرخسی نے اپنی کتاب "الأصول" میں لکھا ہے: فعل کی دو قسمیں ہیں: فعل اور ترک فعل، اور چونکہ ترک (جو افعال کا ایک حصہ ہے) بغیر دلیل کے ہمارے لیے لازم نہیں، تو اسی طرح فعل (قسم اول) بھی بغیر دلیل کے لازم نہیں۔

امام ابن قدامہ نے "المغنی" میں فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی چیز کو ترک کرنا کراہت کی دلیل نہیں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مباح چیز کو بھی ترک کر سکتے ہیں جیسے آپ کیا کرتے تھے۔

امام ابن دقیق العید نے "الإحکام" میں فرمایا: کسی چیز کو ترک کرنا اس کے منع ہونے کی دلیل نہیں۔

پس یہ ثابت ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی چیز کو ترک کرنا اس کے ناجائز ہونے کی دلیل نہیں جب تک اس کے ساتھ ممانعت نہ ہو، اور اسی مفہوم کو علماء نے

یوں بیان کیا ہے کہ" ترک حجت نہیں ہوتا"، اور یہی وہ درست فہم ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سمجھا، اور یہی فہم امت کے سلف وخلف علمائے کرام کے ہاں مسلم اور متحقق رہا۔

لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی عام یا بدل چیز کے بعض افراد کو اختیار کرنا اس عام حکم کے لیے تخصیص یا اس کے اطلاق کو مقید نہیں کرتا، جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باقی چیزوں سے منع نہ فرمایا ہو۔

یہی روشن فہم تھا جس کی بنیاد پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت یا ہدایت کے سورۃ الفاتحہ سے کسی مریض پر دم کیا، اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی تو آپ نے اس پر نکیر نہ فرمائی اور نہ ہی اس کو بدعت قرار دیا، بلکہ اس کی تحسین فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:" تجھے کیسے معلوم ہوا کہ یہ رقیہ ہے؟" (متفق علیہ)، اور بخاری شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:" تم نے درست کیا۔"

یہ بھی ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر خطبہ نہ دیا بلکہ کھجور کے تنے پر خطبہ دیا، لیکن صحابہ نے یہ نہیں سمجھا کہ منبر پر خطبہ دینا بدعت یا حرام ہے، بلکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے منبر بنوا دیا، اور اگر وہ سمجھتے کہ یہ کام ممنوع ہے تو کبھی نہ کرتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترک کو بدعت نہیں سمجھتے تھے۔

اسی طرح حضرت رفاعہ بن رافع الزرقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے، جب آپ نے رکوع سے سر اٹھایا تو فرمایا:" سمع اللہ لمن حمدہ"، تو ایک شخص نے پیچھے سے کہا:" ربنا ولک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ"، جب نماز ختم ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا:" یہ کلمات کس نے

کیے؟" اس نے عرض کیا: میں نے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں نے دیکھا کہ چند (بضعۃ) وتیس فرشتے جھپٹ پڑے کہ ان میں سے کون پہلے اسے لکھے۔"

دیکھیں! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز میں رکوع کے بعد یہ الفاظ نہیں کہے تھے، لیکن صحابی نے یہ نہیں سمجھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس دعا کو نہ کہنا اسے ممنوع بنا دیتا ہے، ورنہ وہ صحابی رسول ایسا نہ کرتے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس پر نکیر نہیں فرمائی، نہ یہ کہا کہ دوبارہ ایسا نہ کرو، نہ ہی آئندہ نمازوں میں دعائیں وضع کرنے سے روکا، اور ہم جانتے ہیں کہ ضرورت کے وقت بیان کا مؤخر کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو رکعت نماز وضو کے بعد ادا کرتے نہیں دیکھا تھا، لیکن انہوں نے خود یہ عمل کیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اطلاع نہ دی، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: "اے بلال! وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے میں نے تمہارے جوتوں کی آہٹ جنت میں اپنے آگے سنی؟" حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "میں نے جو بھی وضو کیا ہے، رات ہو یا دن، میں نے اس وضو کے بعد جو نماز میرے لیے ممکن ہوتی وہ ادا کی۔"

ہم جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل کی تصدیق کے بعد وضو کے بعد کی نماز سنت قرار پائی، لیکن ہم اس واقعے سے صحابہ کے فہم پر استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ترک کے باوجود انہوں نے دعائیں اور عبادات خود سے شروع کیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس انداز اور طرزِ عمل پر نکیر نہیں فرمائی، نہ ہی انہیں مستقبل میں ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

پس یہ تمام دلائل اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا محض کسی کام کو ترک کرنا، حتیٰ کہ قرونِ ثلاثہ میں بھی، بذاتِ خود

کسی چیز کے حرام یا مکروہ ہونے کی دلیل نہیں بنتا۔ اور یہی وہ فہم ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں سمجھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس فہم پر نکیر نہیں فرمائی، اور بعد کے علماء نے بھی اسی کو سمجھا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

سوال 16: ہر مسلمان پر صحابہ کرام کی آپس کی مشاجرات اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا رویہ لازم ہے؟

جواب: امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن نے فرمایا: ہم اہل سنت والجماعت، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان مشاجرات میں حق پر سمجھتے ہیں اور ان کو ان کے مقابل آنے والوں سے افضل اور بلند درجہ والا مانتے ہیں، لیکن ہم ان کے مخالفین کے بارے میں بدگمانی نہیں کرتے، اور ان کے بارے میں اپنی زبانوں کو روک لیتے ہیں، اور ان کے وہی مرتبے مانتے ہیں جو شریعت میں ان کے لیے ثابت ہوئے ہیں۔ ہم کسی کو کسی پر صرف نفسانی خواہش کی بنا پر فضیلت نہیں دیتے اور نہ ہی ان کے درمیان ہونے والے اختلافات میں دخل اندازی کرتے ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک یہ حرام ہے۔ ہم ان کے اختلاف کو اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کا اختلاف۔ اور ہم صحابہ میں سے کسی پر طعن جائز نہیں سمجھتے۔

ہم ایک نہایت اہم نکتہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ حضرت معاویہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اختلاف خلافت کی نزاع نہ تھا، نہ ہی حضرت علی کی فضیلت اور مقام سے انکار تھا اور نہ ہی ان کی خلافت کے استحقاق سے انکار، بلکہ اصل اختلاف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے فوری قصاص لینے یا مؤخر کرنے پر تھا۔

ابن حجر ہیتمی نے "الصواعق المحرقة" میں فرمایا:

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان جو جنگیں ہوئیں، وہ خلافت کی لڑائی نہ تھیں، کیونکہ حضرت علی کی خلافت پر اجماع ہو چکا تھا۔ فتنے کا سبب یہ تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے کیونکہ حضرت معاویہ حضرت عثمان کے چچا زاد بھائی اور ولی تھے۔ لیکن حضرت علی نے ان کے فوری حوالے کو مناسب نہ سمجھا، کیونکہ قاتلین کی تعداد زیادہ تھی، اور وہ فوج میں بھی شامل تھے، اور فوری اقدام سے خلافت کا نظام درہم برہم ہونے کا اندیشہ تھا، خصوصاً یہ کہ خلافت ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ جب ان کی خلافت مضبوط ہو جائے اور اسلامی ریاست مستحکم ہو جائے، تب ایک ایک کر کے ان مجرموں کو پکڑا جائے اور سزا دی جائے۔

ابن حجر عسقلانی نے فرمایا:

یحیٰی بن سلیمان الجعفی جو امام بخاری کے اساتذہ میں سے تھے، انہوں نے کتاب "صفین" میں روایت کیا کہ ابو مسلم خولانی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت کے لیے جھگڑتے ہیں؟ یا آپ ان جیسے ہیں؟

حضرت معاویہ نے جواب دیا: نہیں، میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے افضل ہیں اور خلافت کے زیادہ حقدار ہیں، لیکن کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ حضرت عثمان مظلوم قتل کیے گئے اور میں ان کا چچا زاد اور ولی ہوں؟ میں ان کے خون کا مطالبہ کر رہا ہوں۔

پھر کہا: حضرت علی سے کہو کہ قاتلین کو ہمارے حوالے کریں۔ جب ان سے کہا گیا تو حضرت علی نے فرمایا: وہ میری بیعت کریں اور پھر ان کا مقدمہ میرے پاس لایا جائے۔

حضرت معاویہ نے انکار کیا، پھر حضرت علی عراق سے فوج لے کر صفین پہنچے اور
حضرت معاویہ بھی وہاں پہنچے۔

توجو کچھ صحابہ کے دور میں قتال کی صورت میں ہوا وہ ان کے اجتہاد کی بنیاد پر تھا۔
ہمارے لیے لازم ہے کہ ان کے درمیان ہونے والے اختلاف پر خاموشی اختیار کریں،
دلوں میں ان کی محبت بٹھائیں، زبان سے ان کی تعریف کریں اور کسی کی بھی توہین نہ کریں،
اور جس کا جو مرتبہ ہے اس کو پہچانیں، یہ مانتے ہوئے کہ صحابہ معصوم نہیں تھے، مگر ان کے
اجتہادی خطا پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت کی امید ہے۔

ابن ابی زید القیروانی رحمہ اللہ نے "الرسالۃ" میں عقائد کے بیان میں فرمایا:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی بھی صحابی کا ذکر اچھے طریقے سے ہی کیا جائے،
اور ان کے اختلافات میں خاموشی اختیار کی جائے۔ وہ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان
کے لیے اچھا گمان کیا جائے اور ان کے بارے میں بہتر توجیہات اختیار کی جائیں۔

امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا:
جان لو کہ صحابہ کے درمیان جو خونریزی ہوئی وہ اس وعید میں داخل نہیں جس میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ آمنے سامنے ہوں تو قاتل اور
مقتول دونوں آگ میں ہیں۔"

اہل سنت کا موقف ہے کہ صحابہ کے بارے میں اچھا گمان رکھا جائے، ان کے
اختلافات میں خاموشی اختیار کی جائے، اور ان کے قتال کی توجیہ کی جائے کہ وہ مجتہد تھے،
معصیت یا دنیا کا مقصد نہیں تھا۔

ہر گروہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا، اور دوسرے کو گناہ گار، اور اس وجہ سے اس

سے لڑائی کو واجب جانتا تھا۔ ان میں سے بعض حق پر تھے، اور بعض اجتہادی خطا پر، اور خطا کرنے والا بھی معذور ہوتا ہے، اور اس پر گناہ نہیں ہوتا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

کسی بھی صحابی کی طرف یقینی خطا کی نسبت جائز نہیں، کیونکہ سب نے اجتہاد کیا، اور ان کا مقصد اللہ کی رضا تھا۔ وہ سب ہمارے امام ہیں۔ ہمیں ان کے اختلاف میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ہمیں ان کا ذکر اچھے انداز میں کرنے کا حکم ہے، کیونکہ ان کی صحبت کی حرمت ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو برا کہنے سے منع فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا اور ان سے اپنی رضا کا اظہار فرمایا۔

امام بیہقی نے "السنن" میں روایت کیا:

شعبی نے کہا: جب حضرت حسن بن علی نے صلح کی، اور ہشیم نے کہا: جب حضرت حسن نے حکومت حضرت معاویہ کو سونپی، تو حضرت معاویہ نے ان سے نخیلہ میں کہا:

اٹھو اور تقریر کرو۔

تو حضرت حسن نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور فرمایا:

"بیشک سب سے زیادہ عقلمندی تقویٰ ہے، اور سب سے بڑی بے عقلی گناہ ہے۔ یہ حکومت جس میں میرا اور حضرت معاویہ کا اختلاف تھا، یا تو وہ اس شخص کا حق ہے جو مجھ سے زیادہ حقدار تھا، یا میرا حق تھا جو میں نے حضرت معاویہ کو دے دیا، تاکہ مسلمانوں کی اصلاح ہو جائے اور ان کا خون نہ بہے۔

وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ

(سورۃ الأنبیاء، آیت: 111)

ترجمہ کنز الایمان: اور میں کیا جانوں شاید وہ تمہارے لیے فتنہ ہو اور

ایک وقت تک کا برتنا۔

پھر انہوں نے استغفار کیا اور نیچے اتر آئے۔

اور اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی بھی پوری ہوگئی، جیسا کہ

امام بخاری نے روایت کیا:

"میرا یہ بیٹا (یعنی حسن) سید ہے، اور شاید اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کروادے۔"

تو حضرت معاویہ، جن سے حضرت حسن رضی اللہ عنہما نے صلح کی، ان سے جھگڑا نہ کرو۔ اور یزید، جس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے جنگ کی، اس سے کبھی صلح نہ کرو۔

سوال 17: کیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرمایا ہے؟ اور اس کے دلائل کیا ہیں؟

جواب: جان لو کہ دنیا میں جو بھی کسی چیز کا مالک ہے، خواہ وہ ایک ذرہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کے دینے سے ہی مالک ہے، چاہے وہ علم ہو یا مال یا کچھ اور۔ یہ ایک مسلمہ اسلامی عقیدہ ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت (چیزوں پر اختیار) اللہ کے دیے ہوئے کے طور پر ہے، اور حقیقی مالک صرف اللہ ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ چاہے ملکیت حقیقی ہو یا مجازی، دونوں قسم کی ملکیت قرآن سے ثابت ہیں۔

چنانچہ حقیقی ملکیت کے متعلق فرمایا: "مالک یوم الدین" [الفاتحہ:4]

اور مجازی ملکیت کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے فرمائی:

﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي﴾

عرض کی: اے میرے رب! میں اپنے سوا اور اپنے بھائی کے کسی کا مالک

نہیں۔[المائدۃ:25]

دونوں اقسام کی ملکیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں جمع فرمادیا:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ﴾

یوں عرض کر اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے، اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے، [آلِ عمران:26]

اور فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ﴾

اور اللہ اپنا ملک جسے چاہے دے[البقرہ:247]

پس جیسے ہم اللہ کی حقیقی ملکیت پر ایمان رکھتے ہیں، ایسے ہی ہم اس مجازی ملکیت پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اللہ نے جسے چاہا عطا فرمادی۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو کتاب کے بعض حصے پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں، بلکہ مؤمن تو پوری کتاب پر ایمان رکھتا ہے۔

امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جان لو کہ دین کی بنیاد اور نجات کی اصل یہ ہے کہ پورے قرآن پر ایمان رکھا جائے، اکثر گمراہ اسی لیے ہوئے کہ وہ کتاب کے بعض حصے پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا، جیسے: قدریہ اس آیت پر ایمان لایا:

﴿وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾

"ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے

تھے" [النحل:118]

لیکن اس آیت کا انکار کیا:

﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾

"اور اللہ ہی نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا فرمایا" [الصافات:96]

"جبریہ نے اس آیت پر ایمان لائے: "اور تم کچھ نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ، رب العالمین چاہے" [التکویر:29]

اور اس آیت کا انکار کیا: "یہ ان کے ظلم کی سزا ہے، اور ہم تو سچ بولتے ہیں" [الأنعام:146]

خوارج اس آیت پر ایمان لائے:

﴿وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ، يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ﴾

"یقیناً فجار جہنم میں ہوں گے، وہ اس میں قیامت کے دن داخل ہوں گے" [الانفطار:14-15]

لیکن اس آیت کا انکار کیا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ، وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾

"یقیناً اللہ شرک کو معاف نہیں کرے گا، اور اس کے علاوہ جسے چاہے معاف فرمادے گا" [النساء:116]

مرجئہ ضلال اس آیت پر ایمان لائے:

﴿وَلَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ، إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾

"اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے" [الزمر:53]

اوراس آیت کا انکار کیا:

﴿مَن يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ﴾

"جس نے کوئی برائی کی، اسے بدلہ دیا جائے گا" [النساء:123]

ایسی بہت سی مثالیں ہیں جو علمِ کلام کی کتابوں میں مشہور ہیں۔

قرآنِ عظیم نے جہاں یہ فرمایا:

﴿وَلَا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾

"آسمانوں اور زمین والوں میں سے کوئی غیب کو نہیں جانتا مگر اللہ" [النمل:65]

وہیں فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ، وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ﴾

"اور اللہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے" [الجن:26-27]

اور فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ، وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ﴾

ترجمہ: اور اللہ کی شان نہیں کہ تمہیں غیب پر مطلع کرے مگر اپنے

رسولوں میں جسے چاہے چن لیتا ہے۔[آل عمران:179]

اور فرمایا:

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾

ترجمہ: اور وہ غیب بتانے میں بخیل نہیں[التکویر:24]

﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ، وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾

ترجمہ: اور تمہیں وہ سکھا دیا جو تمہیں معلوم نہ تھا، اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔[النساء:113]

اور فرمایا:

﴿ذَلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ﴾

"یہ غیب کی خبریں ہیں کہ ہم خفیہ طور پر تمہیں بتاتے ہیں"[آل عمران:44]

اور فرمایا:

﴿تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ﴾

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں، جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں"[ہود:49]

تو یہ ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہے جس نے بعض آیات میں غیب کے علم کی نفی فرمائی اور بعض میں اس کا اثبات فرمایا۔

لہٰذا دونوں حق ہیں، دونوں پر ایمان رکھنا فرض ہے۔ جو کسی ایک کا انکار کرے، وہ قرآن کا منکر ہے۔

جو مطلقاً نفی کرے اور کسی صورت میں بھی اثبات نہ کرے، اس نے آیات

اثبات کا انکار کیا۔

اور جو مطلقاً اثبات کرے اور کسی طرح کی نفی نہ کرے، اس نے آیاتِ نفی کا انکار کیا۔

مؤمن ان دونوں پر ایمان رکھتا ہے اور ایک راستے پر قائم رہتا ہے۔ یہ دونوں اقسام ایک ہی مفہوم میں جمع نہیں ہو سکتیں، لہٰذا ان کے مواقع اور محل کو سمجھنا لازم ہے۔

مزید صفحات کے بعد فرمایا:

تحقیق کے بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ علم جو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے، وہ ذاتی علم ہے اور ایسا علم ہے جو تمام اشیاء کا مکمل، تفصیلی، محیط اور حقیقی احاطہ رکھتا ہے۔ یہی مفہوم آیاتِ نفی کا مراد ہے۔

اور جو علم بندوں کے لیے ثابت ہے، وہ عطائی علم ہے، چاہے وہ اجمالی مطلق ہو یا تفصیلی مطلق۔

اسی عطائی علم پر قرآن میں تعریف آئی ہے:

جیسے فرمایا:

﴿وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ﴾

"پس انہوں نے اسے علم والے لڑکے کی خوشخبری دی" [الذاریات: 28]

اور فرمایا:

﴿وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ﴾

"اور یقیناً وہ علم والا ہے اس وجہ سے کہ ہم نے اسے سکھایا" [یوسف: 68]

اور فرمایا:

﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا﴾

"اور ہم نے اسے اپنے پاس سے علم سکھایا" [الکھف:65]

اور فرمایا:

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ

"اور آپ کو وہ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے" [النساء:113]

ایسی بہت سی آیات ہیں۔

پس یہ ہے وہ حق اور صحیح مفہوم، جس سے انکار ممکن نہیں۔

خلاصہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب پر مطلع فرمایا، جتنا چاہا، جب چاہا، اور جتنی مقدار میں چاہا۔

پس ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب میں سے اتنا جانتے ہیں جتنا ان کے رب نے چاہا، جب چاہا، اور جس حد تک چاہا۔

احادیثِ مبارکہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"قام فينا النبي صلى الله عليه وسلم مقامًا، فأخبرنا عن بدء الخلق حتى دخل أهل الجنة منازلهم وأهل النار منازلهم"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور ہمیں مخلوق کی ابتداء سے لے کر جنتی اور جہنمیوں کے اپنے اپنے گھروں میں داخل ہونے تک تمام خبریں سنائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عُرِضَ عَلَيَّ مَا هُوَ كَائِنٌ مِنْ أَمْرِ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ"

"میرے سامنے دنیا و آخرت کے تمام امور پیش کیے گئے۔"

صحابہ فرماتے ہیں:

"فَأَخْبَرَنَا بِمَا كَانَ، وَبِمَا هُوَ كَائِنٌ، فَأَعْلَمُنَا أَحْفَظُنَا"

"آپ نے ہمیں جو کچھ ہو چکا تھا اور جو ہونے والا تھا، سب کی خبر دی، پھر جو ہمیں یاد رہا، وہ ہم نے محفوظ رکھا۔"

فرمایا:

"إِنَّ اللَّهَ زَوَى لِيَ الْأَرْضَ حَتَّى رَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا"

"اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین سمیٹ دی، میں نے اس کے مشرق و مغرب دیکھے۔"

فرمایا:

"فَتَجَلَّى لِي كُلُّ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ"

"میرے لیے سب کچھ ظاہر کر دیا گیا اور میں سب کو پہچان گیا۔"

ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا، امام بخاری سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ اللَّهَ قَدْ رَفَعَ لِيَ الدُّنْيَا، فَأَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهَا وَإِلَى مَا هُوَ كَائِنٌ فِيهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، كَأَنَّمَا أَنْظُرُ إِلَى كَفِّيَ"

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے میرے لیے دنیا کو بلند کیا، میں اسے اور اس میں قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے، ایسے دیکھتا ہوں جیسے اپنی ہتھیلی کو۔"

فرمایا:

"عُرِضَتْ عَلَيَّ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ آنِفًا فِي عُرْضِ هٰذَا الْحَائِطِ فَلَمْ أَرَ كَالْيَوْمِ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ وَلَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا."

"ابھی ابھی جنت اور جہنم میرے سامنے اس دیوار کے پردے میں پیش کی گئیں، آج سے زیادہ میں نے کبھی بھلائی اور برائی نہیں دیکھی، اور اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنسو اور زیادہ رو۔"

فرمایا:

هَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِي هَاهُنَا فَوَاللّٰهِ مَا يَخْفَى عَلَيَّ خُشُوعُكُمْ وَلَا رُكُوعُكُمْ، إِنِّي لَأَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي

"کیا تم میری طرف دیکھتے ہو؟ اللہ کی قسم! تمہاری خشوع وخضوع اور رکوع مجھ سے چھپے نہیں، میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے۔"

فرمایا:

هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ وَيَضَعُ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ هَاهُنَا وَهَاهُنَا، قَالَ: فَمَا مَاطَ أَحَدُهُمْ عَنْ مَوْضِعِ يَدِ رَسُولِ اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم

"یہ فلاں کے قتل کا مقام ہے" اور ہاتھ زمین پر رکھا، اور کسی نے بھی آپ کے ہاتھ کی جگہ سے آگے پیچھے نہیں پایا۔۔۔

اقوالِ ائمہ:

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے پردہ فرمانے سے پہلے وہ تمام امور بتا دیے گئے جو علم میں آسکتے ہیں۔"

سید عبدالعزیز دباغ رحمہ اللہ: "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ چیزیں کیسے چھپ سکتی ہیں، جب کہ آپ کی امت کے اولیاء کا تصرف ان کی معرفت پر موقوف ہے"

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ: بعض علماء نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ غیبی چیزوں کا بھی علم دیا گیا تھا، جیسے قیامت کا وقت، روح، وغیرہ، لیکن ان سے خاموش رہنے کا حکم تھا۔

علامہ مناوی رحمہ اللہ: پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا کُلّی و جزئی احاطہ صرف اللہ کو ہے، مگر اللہ اپنے خاص بندوں کو ان میں سے بعض چیزوں پر مطلع فرما دیتا ہے، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور معتزلہ کا انکار محض ہٹ دھرمی ہے۔

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی رحمہ اللہ: بندہ اللہ کے نور سے غیب کی چیزوں پر مطلع ہو سکتا ہے، جیسے فرمایا: "مومن کی فراست سے بچو، وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

قاضی شوکانی رحمہ اللہ: جب قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ اپنے پسندیدہ رسولوں کو غیب پر مطلع فرماتا ہے تو وہ رسول اپنی امت کے بعض افراد کو بھی غیب کی باتیں بتا سکتا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے بہت سے امور ثابت ہیں۔

امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی صفت تھی جس کے ذریعے آپ غیب کی چیزوں کو جانتے تھے اور ان پر نظر رکھتے تھے۔

سوال 18: کیا اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ اختیارات عطا فرمائے ہیں؟

جواب: دنیا کے کسی بھی انسان کو اللہ کے اذن کے بغیر کوئی کام کرنے کی طاقت حاصل نہیں۔ حتیٰ کہ کوئی انسان مچھر یا مکھی تک کو قتل نہیں کرسکتا جب تک کہ اللہ کا اذن اور ارادہ شامل نہ ہو۔ جب اللہ کا اذن آجاتا ہے تو مچھر جیسے معمولی جانور کو بھی انسان کو مار ڈالنے کی طاقت مل جاتی ہے، جیسا کہ نمرود کے مرنے کی کہانی میں بیان کیا جاتا ہے، اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ مکھی یا مچھر کے ذریعے منتقل کردہ جراثیم کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔

اسی طرح کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر مردوں کو زندہ نہیں کرسکتا، لیکن جب اللہ کی طرف سے توفیق واجازت حاصل ہو جائے تو وہ ایسا کرسکتا ہے، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: "وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ" [آل عمران:49]

اسی طرح کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو اولاد نہیں دے سکتا، لیکن جب اللہ کی مشیت شامل ہو جائے تو وہ جسے چاہے اولاد عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے قول کو قرآن میں نقل کیا گیا ہے: "قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا" [مریم:19] اس نے کہا میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں کہ تجھے ایک ستھرا لڑکا دوں۔

جب یہ سب باتیں معلوم ہوگئیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو صفات کے اعتبار سے مختلف بنایا ہے۔ بعض کو ہزاروں پر فضیلت دی، اور بعض کو عام لوگوں جیسا رکھا۔ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ کسی کے اندر کوئی کمال یا خوبی اس کی ذاتی

نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی عطا ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی کے کمال کو تسلیم کرتے ہیں تو دراصل ہم اللہ کی نعمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ کمالات عطا فرمائے جو کسی اور کو نہ دیے۔ ان کے فضائل و کمالات بے شمار ہیں جن کی حقیقت سوائے رب کے کوئی نہیں جانتا۔ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی امور میں اختیار دیا، ان میں سے چند یہ ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جسے چاہیں اللہ کے اذن سے غنی کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

"وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ" [التوبۃ:74]

ترجمہ کنزالایمان: اور انہیں تو یہی برا لگا کہ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے اذن سے جسے چاہیں عطا کریں اور جسے چاہیں روک دیں، جیسا کہ فرمایا:

"وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا" [الحشر:7]

ترجمہ کنزالایمان: اور جو کچھ تمہیں رسول دیں وہ لو، اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔

نیز فرمایا:

"وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ" [التوبۃ:59]

ترجمہ کنزالایمان: اور اگر وہ راضی رہتے اس پر جو اللہ اور اس کے

رسول نے انہیں دیا۔

اور فرمایا:

"وَسَيُؤْتِينَا اللّٰهُ مِن فَضْلِهٖ وَرَسُولُهٗ" [التوبة:59]

ترجمہ کنز الایمان: اور عنقریب اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے اذن سے چیزوں کو حلال اور حرام بھی کر سکتے ہیں، جیسا کہ فرمایا:

"وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ"

[الأعراف:157]

اور ان کے لیے حلال کرتا ہے پاک چیزیں اور ان پر حرام کرتا ہے خبائث۔

پس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار حاصل ہے جیسا کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے، جیسے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"خبردار! بے شک جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کی، وہ ایسی ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کی ہو"۔

(روایات: احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

اور فرمایا: "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام قرار دیا اور میں مدینہ کو حرام قرار دیتا ہوں۔" (حدیث کے اصل متن میں حرّم صیغہ ہے باب تحریم سے، جس کا معنی حرام بنانا ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ حرم معنی ہو، لہذا استاذ صاحب رہنمائی لیں طلباء)

اور یہ بھی اختیار ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے تین نمازیں

معاف فرمادیں:

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اسلام قبول کیا، اس شرط پر کہ وہ صرف دو نمازیں پڑھے گا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات قبول فرمالی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جسے چاہیں جنت عطا کر سکتے ہیں:

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات گزارا کرتا تھا، ایک دن میں نے آپ کو وضو دیا، تو آپ نے فرمایا: مانگو۔ میں نے کہا: میں جنت میں آپ کی رفاقت مانگتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا اس کے علاوہ کچھ اور؟ میں نے کہا: بس یہی۔ تو آپ نے فرمایا: پھر اپنے نفس پر میری مدد کرکے (یعنی سجدے کی کثرت کرو۔ (روایت: مسلم، ابوداؤد)

اور یہ بھی آپ کے اختیارات میں ہے کہ جسے چاہیں کسی خاص حکم میں خصوصی رعایت دیں، جیسے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا:

حضرت عمارۃ بن خزیمہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوّاء بن حارث سے ایک گھوڑا خریدا، اُس نے انکار کیا، تو حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے گواہی دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم نے کیسے گواہی دی جبکہ تم موجود نہ تھے؟ انہوں نے کہا: میں آپ کو سچا سمجھتا ہوں کیونکہ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے حق میں خزیمہ گواہی دے، وہ کافی ہے۔

اسی طرح ام عطیہ رضی اللہ عنہا کو نوحہ کی اجازت مرحمت فرمائی:

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی

"يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا... وَلَا

يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ" [الممتحنة:12]

تو اس میں نوحہ شامل تھا۔ ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یا رسول اللہ! فلاں خاندان نے جاہلیت میں مجھے نوحہ میں مدد دی تھی، تو مجھے بھی ان کی مدد کرنی ہے۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فلاں خاندان کو چھوڑ کر"۔

اسی طرح حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے عدت کے دوران سوگ سے نرمی فرمائی:

وہ فرماتی ہیں: جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: تین دن تک صبر کرو، پھر جو چاہو کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے متعدد اختیارات عطا فرمائے ہیں۔

سوال 19: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف قرآن کافی ہے، حدیث کی ضرورت نہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ ہمیں صرف قرآن اور حدیث کافی ہے، ان کے علاوہ ہمیں سلف صالحین کی پیروی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: سلف صالحین وہ اولین لوگ ہیں جن میں صحابہ، تابعین اور ان کے متبعین شامل ہیں۔ ان کو سلف اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بعد میں آنے والوں سے پہلے گزر چکے ہیں، اور ان کو صالحین اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان پر اور ان کے زمانے پر اصلاح کا غلبہ تھا۔

عام طور پر سلف صالحین سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان بہترین صدیوں میں تھے، خصوصاً صحابہ اور تابعین کی دو جماعتیں، اور ان میں بعد والے اپنے سے پہلے والوں کی تعظیم کرتے تھے۔

سلف کی پیروی اوران کی اقتدا قرآن وسنت کی نصوص سے ثابت ہے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

1۔ قرآن مجید نے صحابہ رضوان اللہ علیہم کی پیروی اوران کے طریقے پر چلنے کو واجب قرار دیاہے، اور جوان کے راستے کی مخالفت کرے اسے دردناک عذاب کی وعید دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ (النساء:115)

ترجمہ کنز الایمان: اور جو رسول سے جدا ہوا بعد اس کے کہ اسے ہدایت کھل چکی اور مسلمانوں کی راہ کے سوا کوئی اور راہ چلا ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ پھر گیا اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے، اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔

مفسرین نے کہاہے: یعنی وہ جو عقیدہ وعمل کے اس سیدھے دین پر نہیں ہے جس پر صحابہ قائم تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت کو اجماع کی صحت پر دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر وعید سنائی ہے، ویسے ہی مومنوں کے راستے سے ہٹنے پر بھی وعید سنائی ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾(البقرة:137)

ترجمہ کنز الایمان: تو اگر وہ ایمان لائیں جیسا تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پا گئے، اور اگر منہ پھیریں تو وہ تو نرے جھگڑے میں ہیں، تو قریب ہے کہ اللہ ان سے تمہاری طرف کفایت فرمائے، اور وہی ہے سننے جاننے والا۔

یہ صریح دلیل ہے کہ جس پر صحابہ رضوان اللہ علیہم تھے، وہی ہدایت وحق ہے، اور جو ان کے نقش قدم پر چلا وہی سیدھی راہ پر ہے۔

3۔اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾(یوسف:108)

ترجمہ کنز الایمان: تم فرماؤ یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور جو میرے قدموں پر چلیں دل کی آنکھیں رکھتے ہیں اور اللہ کو پاکی ہے اور میں شریک کرنے والا نہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے متبعین تھے، اس لیے وہ بھی بصیرت پر اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے۔

4۔اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح وثنا فرمائی ہے اور ان سے اپنی رضا کا اظہار کیا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ

اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (الفتح:28)

ترجمہ کنز الایمان۔محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل تو انہیں دیکھے گا رکوع کرتے سجدے میں گرتے اللہ کا فضل و رضا چاہتے ان کی علامت اُن کے چہروں میں ہے سجدوں کے نشان سے یہ ان کی صفت توریت میں ہے اور ان کی صفت انجیل میں جیسے ایک کھیتی اس نے اپنا پٹھا نکالا پھر اُسے طاقت دی پھر دبیز ہوئی پھر اپنی ساق پر سیدھی کھڑی ہوئی کسانوں کو بھلی لگتی ہے تا کہ اُن سے کافروں کے دل جلیں اللہ نے وعدہ کیا ان سے جو ان میں ایمان اور اچھے کاموں والے ہیں بخشش اور بڑے ثواب کا۔

اور فرمایا:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍۙ-رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًاؕ-ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (100)

ترجمہ کنز الایمان۔اور سب میں اگلے پہلے مہاجر اور انصار اور جو بھلائی کے ساتھ ان کے پیرو ہوئے اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے

راضی اور ان کے لیے تیار کر رکھے ہیں باغ جن کے نیچے نہریں بہیں ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں یہی بڑی کامیابی ہے۔(التوبہ:100)

اور فرمایا:

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَاؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۔ (الفتح:26)

تو اللہ نے اپنا اطمینان اپنے رسول اور ایمان والوں پر اُتارا اور پرہیزگاری کا کلمہ اُن پر لازم فرمایا اور وہ اس کے زیادہ سزاوار اور اس کے اہل تھے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

5۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کی توثیق اور تزکیہ، جیسا کہ فرمایا:

"خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ"

لوگوں میں سب سے بہترین میرے زمانے کہ لوگ ہیں پھر جو انکے زمانے سے ملے ہوئے ہیں پھر جو ان کے زمانے ملے ہوئے ہیں۔(متفق علیہ)

یہ آیات واحادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ سلف صالحین ہدایت اور خیر پر تھے، اور وہ اتباع واقتدا کے اہل ہیں۔

جو شخص صدر اول کے عمل اور فہم سے ناواقف ہوتا ہے، وہ زیادہ غلطیاں کرتا ہے اور شاذ اقوال لے آتا ہے، اگرچہ اس کے پاس حدیث کا ظاہر بھی ہو۔

سفیان بن عیینہ نے فرمایا:

"حدیث گمراہ کن ہو جاتی ہے سوائے فقہاء کے لیے۔"

ابن ابی زید رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"یعنی وہ شخص جو فقہ نہ رکھتا ہو، وہ کسی حدیث کو اس کے ظاہر پر لے لے گا حالانکہ اس میں کوئی تاویل ہوتی ہے، یا کسی دوسری حدیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے، یا وہ منسوخ ہوتی ہے، یا اس پر اجماع ہے کہ اس پر عمل نہ کیا جائے۔ یہ سب کچھ وہی شخص جان سکتا ہے جس نے علم میں گہرائی حاصل کی ہو۔"

ابن وہب نے کہا:

"جو شخص حدیث کا علم رکھتا ہو مگر اس کا فقہی امام نہ ہو، وہ گمراہ ہوتا ہے، اگر اللہ ہمیں امام مالک اور لیث بن سعد کے ذریعے نہ بچاتا تو ہم بھی گمراہ ہو جاتے۔"

بسا اوقات صحابہ و تابعین کسی صحیح حدیث پر عمل نہیں کرتے تھے، کیونکہ ان کے پاس اس کے ترک کا کوئی جائز سبب ہوتا تھا، اگرچہ وہ اس سبب کو بیان نہ کرتے۔ پس ان کا ترک بذات خود ایک مستقل دلیل ہوتا تھا۔

وہ کسی سنت کے ترک پر جمع نہیں ہو سکتے، نہ کسی غلط کام پر متفق ہو سکتے ہیں۔

ابن ابی زید نے فرمایا:

"سنتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرو، انہیں رائے قیاس سے نہ ٹکراؤ۔
جس چیز کی سلف صالحین نے تاویل کی ہم بھی وہی تاویل کریں گے،
جس پر انہوں نے عمل کیا ہم بھی کریں گے، جسے انہوں نے چھوڑا ہم
بھی چھوڑ دیں گے، جس چیز سے وہ رکے ہم بھی رکیں گے، جسے

انہوں نے واضح کیا ہم اس کی پیروی کریں گے، اور جس پر انہوں نے اجتہاد کیا ہم بھی ان کی اقتدا کریں گے، اور ان کے اختلافی معاملات میں ہم ان کی جماعت سے باہر نہیں ہوں گے۔"

الغرض سلف صالحین کی پیروی میں نجات ہے۔ وہی قابلِ اقتدا ہیں، انہوں نے جس کی تاویل کی وہی تاویل معتبر ہے، اور جس کا استنباط کیا وہی معتبر استنباط ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں صراطِ مستقیم کی دعا سکھائی جو انہی لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (الفاتحہ:6-7)

اور فرمایا:

﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ (النساء:69)

ترجمہ کنز الایمان: تو اُسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ اور یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

اللہ ہمیں اور آپ کو قرآن وسنت پر عمل کرنے، اور سلف صالحین کی اقتدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور گمراہوں کے طریقوں سے ہمیں ہمیشہ محفوظ رکھے۔ آمین یا رب العالمین

☆☆☆